تعارف و ترتیب : محمد اکرام چغتائی

مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک نایاب تحریر

مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ ـ ۱۹۵۸ء) کا شمار اپنی شخصیت اور علمیت کے اعتبار سے عہد آفریں اور تاریخ ساز مشاہیر میں ہوتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی علمی، دینی، فکری، سیاسی، ادبی اور صحافتی تاریخ میں ان کی خدمات اتنی ہمہ گیر ہیں کہ اُنھیں کسی بھی صورت فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آزاد کے رشحاتِ قلم میں جو موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے، اس کا اندازہ ان کی فہرست تالیفات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہو جاتا ہے۔ اُنھوں نے مختلف النوع موضوعات پر قلم اُٹھایا اور ان میں اپنی خداداد ذہانت، وسعتِ مطالعہ، تبحر علمی اور دلکش پیرایۂ اظہار کی بدولت ایک نئی روح پھونک دی۔

مولانا آزاد کے پسندیدہ موضوعات میں مذہب اور سیاست کو نمایاں حیثیت حاصل ہے اور ان کی بیشتر تحریروں کا محور و مرکز یہی دو موضوعات ہیں۔ ان کے علاوہ اُنھوں نے جن دوسرے موضوعات پر اپنی نگارشات چھوڑی ہیں، ان میں ایک موضوع تاریخ بھی ہے۔ مولانا بہت سے نظریات و افکار کو اُن کے تاریخی تناظر میں پرکھتے تھے اور اُنھوں نے مختلف ادیان کا جو تقابلی اور تاریخی محاکمہ کیا ہے، اس سے ان کی تاریخی حقائق پر عمیق نظر اور ان کے تاریخی شعور کا ثبوت ملتا ہے۔ ادیان کے تاریخی مطالعے کے علاوہ اُنھوں نے واقعاتی یا سیاسی تاریخ کو بھی اپنا موضوع تصنیف و تحقیق بنایا ہے اور بعض تاریخی واقعات اور حقائق پر اتنی شرح و بسط اور مدلل انداز سے بحث کی ہے کہ ان میں بلند پایہ مورخ کی

صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اب تک ان کے مقالات کے جتنے مجموعے طبع ہو چکے ہیں، ان میں ایسے تاریخی نوعیت کے مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔ دیگر مقالات کی نسبت ایسے تاریخی مضامین کی تعداد کم تو ضرور ہے، لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا کے ایسے تاریخی مقالات میں سے ایک نایاب تحریر آئندہ صفحات میں پیش کی جارہی ہے۔ یہ مضمون مولانا نے ۱۹۱۶ء میں لکھا تھا، لیکن یہ اب تک شائع ہونے والے ان کے کسی بھی مجموعۂ مقالات میں شامل نہیں ہو سکا۔ اس اعتبار سے موجودہ مضمون کی حیثیت مولانا کی ایک غیر مدوّن تحریر کی ہے۔

مولانا آزاد کی اس غیر مدوّن اور کسی حد تک نامعلوم تحریر کا موضوع یہ ہے کہ کیا مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے حرم میں کوئی عیسائی بیوی بھی تھی؟ مناسب ہوگا اگر یہاں اُس پس منظر کا مختصراً ذکر کر دیا جائے، جس کے تحت مولانا کو اس خالصتاً تاریخی موضوع پر قلم اُٹھانا پڑا۔

اکبر مختلف مذاہب کی تعلیمات جاننے کا طبعی میلان رکھتا تھا، چنانچہ اس نے اپنے دورِ حکومت میں ایک وسیع تر مذہبی مکالمے کا اہتمام کیا، جس میں ہر مذہب کے مبلّغین کو مدعو کیا گیا۔ ان میں مسیحیت کے وہ علما اور پیروکار بھی شامل تھے، جو یسوعی فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور پرتگالیوں کے زیرِ نگیں علاقے گوا میں قیام پذیر تھے۔ دربارِ اکبری میں وقفے وقفے سے جو مسیحی مشن آتے رہے، اُنھوں نے اپنے صدر دفتر کو جو رپورٹیں ارسال کیں، ان میں مبالغہ آرائی کا عنصر غالب ہے۔ اکبر کو مسیحیت میں جو دلچسپی پیدا ہوئی، وہ اصل میں اُس کے متجسس ذہن کی عکاسی کرتی ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اکبر تبدیلئ مذہب پر آمادہ نظر آتا ہے اور کچھ بعید نہیں کہ وہ جلد دینِ مسیح کو قبول کر لے۔ اکبر ان ادیان و مذاہب کی تعلیمات اور عقائد سے متاثر تو ضرور ہوا، لیکن وہ ان میں سے کسی کو قبول نہ کر سکا۔ بلکہ اس نے اپنا راستہ الگ سے نکال لیا اور ایک نئے مذہب کی، جسے "دینِ الٰہی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، بنیاد رکھ دی۔ اس کے باوجود بعض مسیحی مورخین اور مبلغین ایسے شواہد کی تلاش میں ہیں، جن سے اکبر کی مسیحیت سے خصوصی

دلچسپی یا تعلق کو ثابت کیا جا سکے۔ بڑی جانکاہی اور معاصر تاریخی کتب کی غوطہ زنی کے بعد ایسے تاریخ دانوں نے اکبری حرم میں ایک ایسی خاتون کا کھوج لگا لیا، جس کا خطاب مریم زمانی تھا اور اس سے انھوں نے یہ استنباط کیا کہ اکبر کی بیویوں میں ایک کا تعلق مسیحیت سے بھی تھا۔

اکبر کے حرم میں ایک مسیحی خاتون کا باقاعدہ ذکر انیسویں صدی عیسوی کی تاریخی کتب میں آنا شروع ہوا۔ وہیلر (Wheeler) نے "تاریخ ہند" (جلد اوّل، ۱۸۷۵ء، ص ۱۶۳) میں اکبر کی ایک عیسائی بیوی کا ذکر کیا اور اس کے لیے ریورنڈ جان روبسن (Robson) کی روایت کو بنیاد بنایا۔ مؤرخین کے ساتھ ساتھ مسیحی مبلغین اور بالخصوص برصغیر پاک و ہند میں تاریخ مسیحیت سے دلچسپی رکھنے والے اصحابِ قلم نے اپنی تحریروں میں اس بات کو بڑے وثوق کے ساتھ لکھنا شروع کر دیا کہ اکبر کی غیر مسلم بیویوں میں سے ایک کا تعلق مسیحیت سے تھا۔ اس ضمن میں اہم ترین نام فریڈرک فینتھم (Frederic Fanthome) کا ہے، جس نے اپنی کتاب میں اکبر کی مسیحی بیوی کو مسلّمہ تاریخی واقعہ کے طور پر پیش کیا ہے[۱] اور یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ اکبر کی اس بیوی کے والد کا نام Martindell یا Martingall تھا اور وہ دربار میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔

فینتھم نے اپنی کتاب میں جن مصادر کا حوالہ دیا ہے، وہ مؤرخانہ استناد کے اصولوں پر پورا نہیں اترتے اور ان کی حیثیت تاریخی کم اور افسانوی زیادہ ہے۔ اس کے باوجود یہ روایت آگے بڑھتی گئی اور مؤرخین اپنی کتابوں میں اسے ایک تاریخی واقعہ کے طور پر جگہ دیتے رہے۔ ایک پرتگالی مؤرخ اسماعیل گراسیاس (Ismael Gracias) نے اپنی پرتگیزی کتاب (مطبوعہ ۱۹۰۷ء) اور کنکائیڈ (C.A. Kincaid)[۲] نے یہ حکایت بیان کی کہ لزبن سے بہت سی لاوارث خواتین کو بذریعہ بحری جہاز ہندوستان لایا گیا، تاکہ یہاں کام کرنے والے پرتگالی افسران کے ساتھ ان کی شادی کرائی جا سکے۔ انھی خواتین میں ایک کا نام Maria Macarenhas تھا۔ ہندوستان میں اس عورت کو ولندیزی سپاہیوں نے اغوا کر لیا اور وہ اسے سورت لے آئے۔ بعد میں اسے مغلوں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ ناگاہ اکبر کی نظر اس پر پڑ گئی اور یوں وہ شاہی حرم کی زینت بن گئی۔

کیمبل (Campbell) "بمبئی گزیٹیر" (جلد ۱۳، ۱۸۸۲ء، ص ۴۵۳) میں مرقوم ہے کہ مغلوں اور پرتگالیوں کے مابین ۱۵۸۳ء میں لیسائین اور دمام کے مقام پر جو جنگ لڑی گئی تھی، اُس کو ختم کرانے میں ایک پرتگالی خاتون نے اہم کردار ادا کیا تھا اور یہ خاتون اکبری حرم سے تعلق رکھتی تھی۔

حیرت ہے کہ متذکرۂ بالا کتب میں جو واقعات نقل ہوتے ہیں، اُن کی بنیاد قصّے کہانیوں اور غیر معتبر زبانی روایات پر رکھی گئی اور اُن کے لیے کسی قابل استناد ہم عصر یا قریب العصر ماخذ کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ اس کے باوجود اکبر کی عیسائی بیوی کی روایت آگے چلتی رہی اور مسیحی مورخین اس کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھے بغیر درست مانتے رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کسی مقامی یا غیر ملکی مورخ نے اس روایت کے ظاہری افسانوی رنگ کے باوصف اس کو چیلنج نہیں کیا اور یوں یہ ایک مسلّمہ تاریخی حقیقت کے طور پر تسلیم کی جانے لگی۔ بالآخر ۱۹۱۶ء میں یہ روایت تاریخ دانوں کے حلقے میں ایک متنازعہ مسئلہ بن گئی اور مختلف اخبارات اور علمی رسائل میں اس کی موافقت اور مخالفت میں مضامین لکھے جانے لگے۔ دراصل اس نزاعی بحث کا آغاز فادر ہوسٹن کے ایک انٹرویو سے ہوا، جو اس نے اخبار "انگلش مین" کے ایک رپورٹر کو دیا تھا۔ یہ انٹرویو (نامہ نگار کے کچھ اضافوں کے ساتھ) دو اقساط (۱۹ اور ۲۳ اگست کے شماروں) میں اشاعت پذیر ہوا۔ چونکہ آئندہ کئی برسوں تک اس مسئلے پر جو کچھ لکھا گیا، اس کا اصل سبب یہی انٹرویو تھا، اس لیے یہاں اُسے من وعن نقل کیا جا رہا ہے۔

"A discovery of great interest to Mohamedans has been made by Father H. Hosten, S.J., of St. Xavier's College, who believes he is on the right track to prove that Akbar, emperor of India from 1542-1608, had a Christian wife, an Armenian by the name of Maryam Zamani Begam. A large number of questions are consequently involved, the most important being whether she was the mother of the Emperor Jahangir who succeeded Akbar, for Jahangir called

his mother Maryam Zamani. Was she also the mother of Akbar's third son, Prince Danyal, bron in 1572, considering that his mother is called Bibi Maryam? Was she the Maryam Zamani, whose bones are interred in the Rauza Maryam at Agra, opposite Akbar's tomb?

Perhaps one of the most serious difficulties which Father H. Hosten feels in establishing the identity of an Armenian lady with the mother of Emperor Jahangir is that a mosque was built at Lahore in the year 1614, and bears an inscription to the effect that the builder was Maryam Zamani Bibi. Did then, Maryam Zamani Begam, as the Armenian, was called, become Mohammedanized or are we sure that the inscription at Lahore refers to the Maryam Zamani who until now was considered to be Jahangir's mother?

As so many important issues are involved, Father Hosten is engaged in a careful preparation of a paper for the next meeting of the Asiatic Society, on the first Wednesday of September, when he will express his views on the subject. Mohammedans intersted will not leave his statements unchallenged, and if members appear fully prepared for discussion, a most interesting meeting of the Society may be looked forward to."

کلکتہ کے انگریزی اخبار "انگلش مین" میں یہ رپورٹ ۱۹ راگست ۱۹۱۶ء کو شائع ہوئی اور اسے فادر ہوسٹن نے اپنے ہاتھ سے چار دن بعد یعنی ۲۳ راگست کو نقل کیا۔ راقم کو یہ نقل ہوسٹن کے کاغذات سے دستیاب ہوئی جو اب ودیا جیوتی لائبریری (دہلی) میں بحفاظت پڑے ہوئے ہیں[۳۵]۔ اس عبارت کے اختتام پر ہوسٹن نے یہ نوٹ تحریر کیا ہے:

"The note is by a reporter of the "Englishman", who interviewed me. I dictated the notes to him and told him not to change a word. Every change would be a mistake. And so it was: 5 mistakes and serious ones."

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہوسٹن کو اس موضوع سے خصوصی لگاؤ تھا۔ وہ مختلف ذرائع

اور مآخذ سے ایسے شواہد جمع کرتا رہا، جن کی بنیاد پر وہ یہ ثابت کر سکے کہ اکبر کے حرم میں ایک عیسائی خاتون موجود تھی۔ اخبار "انگلش مین" کے نامہ نگار کی مندرجہ بالا رپورٹ میں جس زیرِ تحریر مضمون کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اسی سال یعنی ۱۹۱۶ء کے اواخر میں ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں طبع ہوا۔ علاوہ ازیں ہوسٹن نے کئی اور مضامین بھی لکھے، جو اُسی سال مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئے ۱۴۵

ہوسٹن وہ واحد مسیحی مؤرخ ہے جس نے اپنی عمر کا بیشتر حصّہ دَورِ مغلیہ میں عیسائیت کے آثار تلاش کرنے میں صرف کر دیا۔ کیتھولک فرقے سے تعلق رکھنے والے سیاحوں کے سفرناموں، مبلغین کی رپورٹوں اور مغل دربار میں دینِ عیسوی کی ترویج اور اس کے سیاسی اثرات میں اضافہ کرنے والی شخصیات کے سوانحِ حیات اور کارہائے نمایاں پر اس کا علمی اور تحقیقی سرمایہ قابلِ قدر ہے۔ یہ اُسی کے مطالعات کا نتیجہ ہے کہ ایسے متعدد سفرنامے وغیرہ دریافت ہوئے، ان کے انگریزی تراجم شائع ہوئے اور ایسے موضوعات پر مستقل تصانیف بھی منظرِ عام پر آنے لگیں۔ اس نئے دریافت شدہ مواد کی بدولت مسیحی مآخذ تاریخِ مغلیہ کا ایک لازمی حصّہ بن گئے اور کسی بھی مؤرخ کے لیے اُن سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہ رہا۔ اگر بغور دیکھا جائے تو ہوسٹن نے اکبر کی عیسائی بیوی جیسے موضوع پر جو کچھ لکھا، اس کا اصل محرک مغل بادشاہوں کے مسیحیت کے ساتھ قریبی تعلق کو ثابت کرنا تھا۔ اگر ہوسٹن کے ایسے تمام مطالعات کو دیکھا جائے تو ان میں درج ذیل نکات کارفرما نظر آتے ہیں:

۱۔ اکبر کی والدہ حمیدہ بیگم اور اس کی ہندو بیوی اور جہانگیر کی والدہ بالترتیب مریم مکانی اور مریم زمانی کے خطابات سے یاد کی جاتی تھیں۔ معاصر تاریخوں میں ان دونوں خواتین کے یہی خطاب دیے گئے ہیں۔ ان خطابات میں لفظ "مریم" ہوسٹن کی تحقیقات کا سبب بنا اور وہ یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کرتا رہا کہ یہ نام کسی مسیحی خاتون ہی کا ہو سکتا ہے، جو کسی ذریعے سے مغلیہ دربار تک پہنچ گئی۔

۲۔ آگرہ میں دو ایسی عمارات ہیں، جو روایتی طور پر مریم کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں۔

ان میں ایک "مریم کی کوٹھی" یا "سنہرا مکان" کہلاتی ہے اور یہ فتح پور میں موجود ہے۔ دوسری عمارت سکندرہ میں واقع وہ مقبرہ ہے جس میں مریم نامی خاتون مدفون ہے۔ اوّل الذکر عمارت کی دیواروں پر یونانی طرز کی صلیب اور مریم اور ایک فرشتے کی تصاویر بھی بنائی گئی ہیں۔ اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ محل اکبر کی عیسائی بیوی بی بی مریم نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ خاتون نسلاً پرتگیزی تھی اور جب وہ ہندوستان پہنچی تو اُسے شاہی حرم میں شامل کر لیا گیا [۵]

۳۔ آگرہ میں یسوعی مبلغین کا ایک دستاویز خانہ بھی تھا جس میں پرانی دستاویزات وغیرہ کو حفاظت سے رکھا گیا تھا۔ انہی دنوں اس ریکارڈ میں سے ۱۶۴۷ء اور شاہ عالم کے زمانے کے پروانے دریافت ہوئے۔ اوّل الذکر میں مریم پیاری نامی ایک عورت نے یہ بیان کیا تھا کہ جس مکان میں وہ رہائش پذیر ہے، وہ کسی پادری کی ملکیت تھا۔ دوسری دستاویز میں منقول ہے کہ آگرہ میں یسوعیوں کی عبادت گاہ، جس عمارت میں ہے وہ مریم نام کی کسی خاتون کی عطا کردہ ہے۔

۴۔ ۱۹۱۶ء میں دو ایسی تصاویر سامنے آئیں جن کی وجہ سے ہوسٹن کو کامل یقین ہو گیا کہ اکبر کی ایک بیوی دینِ عیسوی سے تعلق رکھتی تھی۔ ہوسٹن کا جو مضمون کلکتے کے انگریزی روزنامہ "سٹیٹس مین" میں چھپا (بابت ۱۶ ستمبر ۱۹۱۶ء)، اس کے ساتھ ایک تصویر بھی دی گئی تھی، جس میں اکبر کے ہمراہ ایک عورت بیٹھی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ اس نے اپنے گلے میں صلیب پہن رکھی ہے۔ اکبر نے اپنا دایاں ہاتھ اس خاتون کی گردن پر ڈال رکھا ہے۔ ظاہری طور پر یہ عورت پرتگالی یا ارمنی دکھائی دیتی ہے۔ یہ تصویر دہلی کے میور پریس کے مالک لالہ بلاقی داس کے پاس تھی اور اس سے یہ قرولی کے سابق وزیر اعظم نواب مرزا اکبر علی بیگ (سال وفات ۱۹۱۰ء) نے حاصل کر لی تھی۔ ۱۹۰۲ء میں مرزا موصوف نے اپنی نواسی کو یہ تصویر دے دی، جس کی شادی کلکتہ میں مقیم ٹیپو سلطان کے خاندان سے تعلق رکھنے والے شخص بختیار شاہ سے ہو چکی تھی۔ یہ تصویر ایک انگریز سٹیفن نے خرید لی اور اس کی وساطت سے یہ ۱۹۱۶ء میں ہوسٹن کے پاس

پہنچ گئی۔ اس تصویر کے نیچے یہ عبارت بھی درج ہے۔

"جلال الدین اکبر و مریم زمانی بیگم"

اسی سال یعنی ۱۹۱۶ء ہی میں لالہ بلاقی داس کے ذخیرۂ تصاویر میں سے ایک اور تصویر دستیاب ہوئی، جس میں پہلی تصویر ہی کی طرح اکبر کو ایک غیر ملکی خاتون کے ساتھ بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ دوسری تصویر میں نیچے کوئی عبارت درج نہیں۔ یہ تصویر سروے آف انڈیا کے ذریعے ہوسٹن تک پہنچی اور اُس نے اس کے حوالے سے اپنے موقف کی تائید میں ایک اور مضمون لکھ ڈالا۔ یہ مضمون بھی "سٹیٹس مین" اخبار میں طبع ہوا (بابت ۱۶ نومبر ۱۹۱۶ء)

یہی وہ بڑے دلائل تھے، جن کی بنیاد پر ہوسٹن نے اپنے ایک پسندیدہ موضوع کی عمارت استوار کی اور یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ اکبر کی ایک عیسائی بیوی بھی تھی۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اس ضمن میں ہوسٹن کی تمام تحریروں میں جانبدارانہ طرزِ عمل کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اس نے ایک کمزور روایت کو تاریخی حقیقت کا روپ دینے کی کوشش کی ہے اور اس کے لیے اُس نے تاریخ نگاری کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ دورِ مغلیہ کے مستند تاریخی مصادر کے بجائے اپنی تحقیق کی بنیاد غیر معتبر اور داستانوی روایات پر رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کمزور بنیادوں پر تعمیر کردہ اس عمارت پر ایک کاری ضرب پڑی تو یہ دھڑام سے نیچے آن گری۔ کچھ ہی برسوں میں نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ غیر تو غیر ہوسٹن کے اپنے ہم مذہب مورخین نے بھی اُس کی تحقیق کو درست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی ایک مثال سر ایڈورڈ میکلیگن کی ہے جو چند سال (۱۹۲۱ – ۱۹۲۴ء) پنجاب کا گورنر بھی رہا۔ وہ ہوسٹن کے قریبی دوستوں میں سے تھا اور برسوں تک ان دونوں میں مراسلت چلتی رہی۔ میکلیگن کے بہت سے مکتوبات اب بھی ہوسٹن کے نجی کاغذات میں ودیا جیوتی (دہلی) کے کتاب خانے میں محفوظ ہیں۔ ان دوستانہ مراسم کے باوجود میکلیگن نے اپنی اہم ترین کتاب میں اکبر کی مسیحی بیوی کے موضوع پر ایک علیحدہ باب مختص کیا اور اس میں ہوسٹن کے متذکرۂ بالا تمام شواہد کو علمی انداز سے ناقابلِ تسلیم قرار دیا۔[۵۶] اب تو حال یہ ہے کہ ہوسٹن کی تحقیق کے اس ناپختہ محل کے کھنڈرات بھی دکھائی نہیں دیتے اور گذشتہ چند برسوں میں برصغیر پاک و ہند میں مسیحیت کی تاریخ پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں اُن میں اکبر اور

یسوعی مبلغین کے متعلق تو معلومات ملتی ہیں، لیکن اکبر کی کسی عیسائی بیوی کا نام تک نہیں لیا جاتا۔ بالفاظِ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مؤرخین اور عیسائی مبلغین نے انیسویں صدی عیسوی میں اور خاص طور پہ ۱۹۱۶ء میں اکبر کی عیسائی بیوی کے مسئلے کو جس شد و مد اور وثوق کے ساتھ پیش کیا، اب اُن کے ہم مذہب مورخین بھی اس کے استناد کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں اور اپنی تواریخ میں اس کا ذکر تک نہیں کرتے ہیں۔[۵۹]

ہوسٹن اور اس کے متبعین نے درج بالا کمزور روایات کے سہارے جو عمارت استوار کی تھی، اُس کو جس نے اپنے تیشۂ تحقیق کی ایک ہی ضرب سے زمین بوس کر دیا اور جس کے عالمانہ دلائل نے اس باب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا، وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات تھی۔ جب ۱۹۱۶ء میں اکبر کی عیسائی بیوی کے موضوع پہ کلکتہ کے انگریزی اخبارات اور رسائل میں تواتر سے مضامین چھپنے لگے، ان دنوں مولانا رانچی کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں اپنے ایامِ اسیری گزار رہے تھے[۶۰]۔ اس موضوع پہ ہوسٹن کے حوالے سے ابتدا کی دو تحریریں "انگلش مین" کے دو شماروں (بابت ۱۹ اور ۲۳ اگست) میں شائع ہوئیں اور یہ مولانا کی نظر سے گزریں۔ پہلی تحریر ہوسٹن کے انٹرویو سے متعلق ہے جو اس اخبار کے ایک نامہ نگار نے لیا تھا اور یہ ہوسٹن کے نجی کاغذات سے تلاش کر کے مکمل طور پر اوپر کی سطور میں نقل ہو چکا ہے۔ اس تحریر کے آخر میں نامہ نگار نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ ہوسٹن نے اکبر کی عیسائی بیوی کے بارے میں جو دعویٰ ہے، کوئی نہ کوئی مسلمان اُس کو ضرور چیلنج کرے گا۔ اس نامہ نگار کا یہ خدشہ درست ثابت ہوا اور مولانا نے فی الفور اس انٹرویو اور ۲۳ اگست کے شمارے میں شائع ہونے والی تحریر کے مندرجات کا انتہائی مدلل اور مفصل جواب لکھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، اس وقت مولانا ایک دور افتادہ علاقے میں نظر بند تھے اور اُن کے پاس مطالعے کے لیے کتابیں بھی نہیں تھیں، اس کے باوجود اُنھوں نے ہوسٹن کے تمام دلائل کا مثبت جواب دیا۔ اس سے ایک تو مولانا کے مستند تاریخی کتب کے گہرے مطالعے اور دوسرے اُن کی مثالی قوتِ حافظہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اپنے جوابی مضمون میں بار بار اس کا ذکر کرتے ہیں کہ ان کی تمام کتابیں کلکتہ میں ہیں۔ اگر یہ سب اُنھیں دستیاب ہوتیں تو معلوم نہیں، اُن کی تحقیق اور کیا رنگ دکھاتی۔ مزید یہ کہ مولانا نے اپنے اس طویل مضمون کو

واقعات کی کھتونی نہیں بنایا، بلکہ اُن کی یادداشت میں حاصل مطالعہ کی شکل میں جو کچھ محفوظ تھا، اُس کو شگفتہ اور رواں طرزِ تحریر میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ مضمون نہ صرف مولانا کے مطالعۂ تاریخ کی وسعتوں کی ترجمانی کرتا ہے، بلکہ یہ اُن کے دل نشین اسلوبِ نگارش کا بھی ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

مولانا آزاد نے ہوسٹن اور "انگلش مین" کے نامہ نگار ایم۔ اے۔ الف کے جواب میں جو مفصل مضمون لکھا، اس کا عنوان "اکبر اعظم اور مسیحی حرم" ہے۔ یہ امرتسر کے اردو اخبار "وکیل" میں تین قسطوں میں شائع ہوا[۹] اُن دنوں کلکتہ، دہلی وغیرہ سے متعدد اردو اخبارات اور رسائل چھپ رہے تھے اور اُن کے مدیران مولانا کی تحریر کو خوشی سے شائع کر سکتے تھے، لیکن اس کے باوجود مولانا نے اپنا مضمون ایک ایسے اخبار کو بغرض اشاعت بھیجا جو ان علمی اور صحافتی مراکز سے خاصا دور تھا۔ اس کی ایک ہی وجہ تھی اور وہ یہ کہ مولانا کا "وکیل" کے ساتھ ایک دیرینہ تعلق چلا آرہا تھا۔ مولانا نے ۱۹۰۶ء کے اوائل میں اس اخبار کے ادارتی فرائض سنبھالے تھے اور آٹھ ماہ گزار کر اسی سال نومبر میں اپنے بڑے بھائی ابو نصر غلام یٰسین آہ کی وفات کی خبر سن کر کلکتہ چلے گئے تھے۔ اگلے برس واپس آئے اور دوسری بار آٹھ یا نو ماہ اس اخبار کے مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ مولانا کے دورِ ادارت کے فائل اب بھی کتاب خانہ خدا بخش (پٹنہ) میں محفوظ ہیں اور ان کے مطالعے سے مولانا کے سوانح اور افکار پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد مولانا نے "الہلال" اور "البلاغ" کا اجرا کیا، لیکن اس کے باوجود انھوں نے "وکیل" کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلق کو منقطع نہیں کیا اور وقتاً فوقتاً مختلف دینی اور تاریخی موضوعات پر اپنی نگارشات اس اخبار کو بھجواتے رہے[۱۰] مقامِ افسوس ہے کہ متعدد اہم اخبارات و رسائل کی طرح مکمل "وکیل" بھی کسی کتاب خانے میں دکھائی نہیں دیتا۔ راقم نے برصغیر پاک و ہند کے علاوہ یورپ کے کئی معروف کتاب خانوں میں اس اخبار کو تلاش کرنے کی کوشش کی، لیکن چند منتشر پرچوں کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اگر کبھی اس اخبار کے فائل دستیاب ہو جائیں، تو مولانا آزاد جیسی بہت سی علمی شخصیات کی متعدد ایسی تحریریں منظر عام پر آجائیں جو ابھی تک عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ بہرحال اس وقت "وکیل" کے بکھرے ہوئے اوراق میں سے مولانا آزاد کی جو غیر مدوّن تحریر دستیاب ہوئی ہے، اس کو اُن کے شائقین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔